طاہرہ غفور

لیکچرر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

کاظم حسین

ایم ایس سکالر، شعبہ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

''امراؤ جانِ ادا'' کے پلاٹ کی پیچیدگیوں کا تجزیاتی مطالعہ

Abstract:

"Umrao Jaan Ada" is a renowned Urdu novel written by Mirza Haadi Ruswa and published in 1899. The novel is considered a masterpiece of Urdu literature, known for its vivid portrayal of the cultural and social milieu of 19th century Lucknow, India.Set against the backdrop of 19th century Lucknow, the novel provides insight into the Nawabi culture, the decline of the Mughal Empire, and the evolving social dynamics of the time."Umrao Jaan Ada" delves into themes of resilience, identity, and the power of art to transcend societal limitations. The protagonist's journey offers a glimpse into the struggles faced by women in a patriarchal society and emphasizes the multifaceted nature of her character. The novel's ensuing appeal has led to numerous adaptations in various forms of media, solidifying its status as a timeless work that continues to capture the hearts of readers and audiences worldwide.

Keywords:

Renowned novel, nawabi culture. protagonist's journey. multifaceted nature.

مرزا رسوا کے ناول لکھنوی معاشرت کے بہترین عکاس ہیں۔ ان کا ناول افشائے راز ایک رومانوی قسم کا ناول تھا۔ اس میں ذکی سیرت کو مرزا نے انوکھے انداز میں پیش کیا۔ ذات شریف میں اعلیٰ طبقے کی تصویر کشی تھی جس میں انھوں نے ایک سیدھے سادھے نواب کو جادو ٹونے کے سحر میں پھنسا کر لوٹنے کا حال بیان کیا ہے۔ درمیانے یا ادنی طبقے کی حالت اکبری بیگم میں دکھائی دیتی ہے۔ شریف زادہ میں انہوں نے ایک ایسے مثالی شخص کو پیش کیا جس نے ذاتی ہمت و کوشش سے کامیابی حاصل کی۔ امراؤ جان ادا میں بظاہر ایک طوائف کی داستان نظر آتی ہے لیکن گہرے مشاہدے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس ناول میں رسوآ نے غدر سے کچھ پہلے اور بعد میں لکھنؤ

کی تنزلی کو بیان کیا ہے۔ لکھنوی معاشرت کا یہ دور بے چینی و اضطراب کا دور تھا۔ اس عہد میں لکھنو کا طبقہ اشرافیہ کھوکھلے معاملات میں الجھا نظر آتا ہے۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں لکھنو کے نواب زادوں، سفید پوشوں، طوائفوں، چوروں، ڈاکوؤں اور بیگمات کی معاشرت کو پیش کیا ہے۔ رسوا نے اس تہذیب کی تنزلی کی وجوہات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیسے ڈیرہ دار طوائفیں نوابوں کی جڑوں میں بیٹھتی ہیں۔ مصاحبین کیسے سچ جھوٹ ملا کر اپنی قیمت بڑھاتے ہیں اور نہ صرف اشرافیہ بلکہ ادنی طبقہ بھی بہتی گنگا میں بہہ رہا ہے۔ لہٰذا معاشرہ عروج کے بجائے زوال کی طرف گامزن ہے۔ رسوا نے اس معاشرت کی اخلاقی کمزوریاں دیکھیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ معاشرے کی اخلاقی اقدار کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ عیش و عشرت اس معاشرے کے زوال کی بڑی وجہ تھی۔ انھوں نے معاشرے کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ جن کی طرف کسی کو نظر اٹھانے کی جرأت نہ تھی اور زندگی کے فلسفیانہ رخ سے آشنا کروایا۔ اس وقت معاشرے کی تنزلی اس حد تک تھی کہ طوائفوں سے نفرت ہونے کے باوجود تمام معاشرتی رسموں میں ان کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی حتیٰ کہ مذہبی رسموں میں بھی یہ شامل ہوتی تھیں۔

رسوا نے طوائفوں سے نفرت کے بجائے ہمدری کا جذبہ ابھارا۔ انھوں نے یہ بات عیاں کی کہ طوائفیں معاشرے کی اپنی پیداوار ہیں۔ کسی کا تعلق شریف گھرانے سے ہے اور کوئی اغوا ہو کر یہاں پہنچتی ہے۔ حالات انہیں طوائف بننے پر مجبور کر دیتے ہیں اور وہ نوابین اور تماش بینوں کی خلوت کی ساتھی بن جاتی ہیں۔ پیشے کی ضرورت کے تحت محبت کا ڈرامہ رچانا ان کی مجبوری بن جاتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ طوائف کسی سے محبت نہیں کر سکتیں کوئی زور زبردستی کرتا اور کوئی ان کا مددگار بن جاتا۔ ایسے حالات ان کو زندگی کے نئے رخ سے متعارف کرواتے نہ صرف نوابین بلکہ متوسط طبقے کی معاشرت بھی ان پر عیاں ہو جاتی۔ اس طبقے کے مردوں سے تو وہ پہلے سے واقفیت رکھتی تھیں لیکن عورتوں کے رہن سہن سے بھی واقف ہو جاتی ہیں۔

رسوا نے اس زوال پذیر معاشرت کی عکاسی کے لیے خانم کے نگار خانے کا انتخاب کیا۔ جہاں سے زندگی کے مختلف پہلو صاف دکھائی دیتے ہیں اور یہاں بھی رسوا نے خود کو یا خانم کو مرکز نہیں بنایا۔ بلکہ اس کے لیے امراؤ جان ادا کا انتخاب کیا کیونکہ وہ کوئی خاندانی طوائف نہیں تھی بلکہ حالات واقعات نے اسے طوائف بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے اس پیشے سے نفرت تھی۔ اس کے رویے ہم طبقہ اشرافیہ کے رذائل اور عام عوام سے شناسائی حاصل کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر رسوا خانم کے نگار خانہ کو مرکز نگاہ نہ بناتے تو یا صرف اعلیٰ طبقے کی تصویر دیکھنے کو ملتی یا ادنی طبقے کی۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں پر ہر طبقے کا آنا جانا تھا۔ امراؤ جان ہمیں ہر طبقے کے چھوٹے بڑے کرداروں

سے ملواتی ہے۔ گوہر مرزا، نواب سلطان، بسم اللہ جان، نواب چھبن، ڈاکو فیض علی، اکبر علی خان اور آبادی سے ملوا کر گویا لکھنؤ کی تہذیب سے بھی روشناش کروادیتی ہے۔

امراؤ جان ادا کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس ناول کی ہیروئین کا کردار لکھنوی طوائف کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔ امراؤ جان ادا ہمیں جس معاشرت سے تعارف کرواتی ہے اس میں اودھ زوال پذیر تہذیب نمایاں ہے۔ نگار خانے کے علاوہ وہاں کے میلے ٹھیلے، ٹھگوں کی کی وارداتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں۔ رسوانے ان لٹیروں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہمیں ان سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔

کسی تہذیب کے عروج میں وہاں کے معاشرتی، جغرافیائی اور تاریخی حالات کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور یہی عناصر اس کے زوال کا باعث بھی بنتے ہیں۔ لکھنو کے تہذیبی عروج و زوال میں بھی یہی عناصر کارفرما ہیں یہ اپنی جغرافیائی اور معاشی زرخیزی کی وجہ سے توجہ کا باعث بنا رہا ہے مختلف تہذیبوں کے لوگ یہاں آتے اور یہیں کے ہو کر رہ جاتے۔ یہاں کے خوبصورت موسم و حسین مناظر باعث کشش تھے لیکن جب یہاں کے وسائل کو عملی قوتوں کے بجائے سطحی آراشوں پر صرف کیا گیا تو عروج کو زنگ لگنا شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت اور بسنے کی تاریخ کافی پرانی ہے جو سولہویں صدی عیسوی تک قائم رہتی ہے۔ جسے ہم اس تاریخ کا سب سے شاندار دور کہہ سکتے ہیں۔ مغلوں کا عہد ہندوستان میں شمشیر و سناں اول کا دور تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ سنگ مرمر میں بدل گیا اور محمد شاہی دور میں تو اس صاحب علم قوم نے ایک بہادر قوم کی حیثیت اختیار کر لی۔

اگرچہ سیاسی لحاظ سے یہ زوال کا عہد تھا لیکن تہذیبی اعتبار سے اس میں ایک نیا رنگ پیدا ہوا جس نے یہاں کے تقریباً ہر شعبے کو متاثر کیا۔ دہلی اس زمانے میں اسلامی تمدن کی بہترین مثال تھا لیکن جلد ہی لکھنو نے اس کی جگہ لے لی۔ سلطنت اودھ نے معاشرت کی قدروں کو اپنایا اور دلی کے اجڑنے کے بعد اصحاب علم و فن لکھنو میں آبسے۔ نوابانِ اودھ نے لکھنو کو تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دیا۔

مولانا شرر نے اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے اس معاشرت کی ایک جھلک مولانا شررؔ نے یوں دکھائی ہے۔

> ''شجاع الدولہ کا طبعی میلان عورتوں اور رقص و سرور کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اس

سے خالی نہ تھا اور نواب کے انعام واکرام سے وہ اس قدر خوشحال اور دولتمند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں۔"[1]

اس ظاہری رونق کے نتیجے میں لکھنو میں ایسا سامان جمع ہو گیا کہ لکھنو کے دربار کی سی شان وشوکت کہیں نہیں تھی پورے ہندوستان میں جو عروج لکھنو کو حاصل ہوا وہ کسی اور شہر کو حاصل نہ ہو سکا۔

شجاع الدولہ جو پیسہ فوج پر خرچ کرتے تھے آصف الدولہ نے اسے اپنی عیش پرستی پر خرچ کیا سارا زور اسی بات پر تھا کہ میرے دربار کی شہرت ہو۔ لکھنو کے آخری نوابوں خاص طور پر واجد علی شاہ اختر کے زمانے میں یہ شوق جنون کی شکل اختیار کر گیا۔ تمام ہندوستان کے بہترین شاعروں اور طوائفوں نے یہاں ڈیرے ڈال لیے۔ طبقہ اشرافیہ کی دیکھا دیکھی متوسط اور ادنی طبقہ بھی اسی دھارے پر بہنے لگا۔ واجد علی شاہ اپنی شہوت پرستی اور رنگیلا اپنی عیش پرستی کی کھلے عام تشہیر کرتا۔ نواب مرزا شوق کی شاعری نے عشق و عاشقی کے وہ جذبات گرم کیے کہ شائستہ لوگ بھی اس سے اپنے ذوق کی تسکین کیے بنا نہ رہ سکے۔ گویا اودھ کی معاشرت میں طوائف اور شاعری روح بس گئے تھے۔ مرزا رسوا نے اپنے ناول امراؤ جان ادا میں انہی نقوش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

امراؤ جان ادا کا پلاٹ فنی اعتبار سے بہت مضبوط ہے۔ اس ناول کا فارم "پکارسک"[2] ہے یعنی اس میں ایک مخصوص فرد امراؤ جان ادا کو لے کر اس کی زندگی کے حالات گزرتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے ماحول سے متعلق دکھائے گئے ہیں کہ اگرچہ اس میں اس قسم کی تعمیر نہیں جیسا کہ عموماً ڈرامائی ناول میں ملتی ہے۔ ناول میں قصہ ہیروئن نے خود بیان کیا اور مرزا رسوا قصہ سننے والے کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہیں۔ ناول میں تمام واقعات ایک عمدہ تناسب سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہر اچھے ناول کی طرح اس کا پلاٹ بھی دوسرے چھوٹے چھوٹے پلاٹوں سے مل کر بنا ہے۔ جیسے رام دئی کے حالات، بسم اللہ کا بانکپن، بوا حسینی کا کردار، خورشید کی مخلص طبیعت وغیرہ۔ اگر امراؤ جان ادا اپنا قصہ محض تاریخی ترتیب دے بیان کرتی تو شاید اتنا دلچسپ نہ ہوتا۔ اسی لیے ناول کا پلاٹ اس ترتیب سے ہے کہ جو واقعہ جس جگہ چاہیں وہاں لے آئیں۔ وہ واقعہ تاریخی حساب سے پہلے کا ہو یا بعد کا۔ جن واقعات کی جتنی اہمیت ہے اتنی ہی جگہ ان کو دی گئی ہے۔ امراؤ جان کے دربار اودھ سے تعلق کو چند الفاظ میں ہی بیان کیا گیا ہے۔ جبکہ امراؤ جان کا ایک نوچی کو بٹھانا ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بابت رسوا جاننا چاہتے تھے اور امراؤ جان کو اس سے دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا اس واقعہ کو سرسری بیان کر دیا۔ اکبر علی خان کے گھر میں لڈن کی ماں والا واقعہ وضاحت سے بیان کر دیا کیونکہ اس واقعے سے امراؤ نے ظاہر کیا کہ رنڈی ہونے کی وجہ سے نیچ سے نیچ

عورت بھی رنڈی کو اپنے سے کمتر سمجھتی ہے۔ ناول کی شناخت میں بھی ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ ہے۔ غرض رسوا کو فطرت نے جتنی صلاحیتیں دی تھیں وہ اس ناول کے پلاٹ میں ایک مرکز پر آکر کار فرما ہیں۔ امراؤ جان ادا کے پلاٹ کے بارے میں ڈاکٹر میمونہ انصاری لکھتی ہیں کہ :

''امراؤ جان ادا کے پورے پلاٹ میں قواعد کی پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ کسی طرف سے بھی جھول نہیں۔ اس کا ہر کردار اور کرداروں کی گفتگو پلاٹ میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے میں مدرگار ہیں۔ ہر باب کے آغاز میں ایک شعر لکھا گیا ہے جو نفس مضمون کا اشاریہ ہے۔ جگہ جگہ امراؤ جان اور رسوا کا مکالمہ ہے جو قصے کو کامیاب طریقے سے آگے بڑھاتا ہے اور فطری بنانے میں مدرگار ہوتا ہے۔ پلاٹ کی خوبصورتی کے بعد امراؤ جان اور رسوا کا مکالمہ ہے جو قصے کو کامیاب طریقے پر آگے بڑھاتا ہے اور فطری بنانے میں مدرگار ہوتا ہے۔ ''[۳]

پلاٹ کی خوبصورتی کے بعد ''امراؤ جان ادا'' کے کرداروں پر نظر ڈالی جائے تو رسوا کے کردار اپنی جگہ نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کی تخلیق میں انفرادی مقاصد ہیں جو کہ خاص ضرورت کے تحت تخلیق کیے گئے ہیں۔ انفرادیت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ ہر کردار ایک خاص نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتا ہے اور پھر غائب ہو جاتا ہے مثلاً نواب جعفر علی بوڑھا کھوسٹ ہے مگر ابھی تک خود کو لائق محبت سمجھتا ہے۔ اس کردار کی روشنی میں اس طبیعت کے نوابوں کا پورا طبقہ سامنے آجاتا ہے۔ بیگم جان گانے میں ماہر ہیں لیکن خوبصورت نہیں ہیں۔ بسم اللہ خوبصورت ہے اور اپنی اداؤں کی داد لیتی ہے نواب سلطان مستقبل کا اشارہ ہیں جو حق کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ رسوا کا فن عروج کو پہنچا ہوا ہے اس قدر صاف ستھرے خاکے ہیں کہ ان کا اندرونی تضاد بھی قابل تعریف ہے۔

رسوا نے ناول میں بہترین مناظر کشی سے افراد قصہ کے ذہنی پس منظر اور تہذیبی رجحانات کی جھلک دکھادی ہے اور کوئی بھی ناول نگار جتنا اچھا منظر نگار ہوتا ہے۔ اتنی ہی صاف اور واضح تصویر قاری کے سامنے لانے میں کامیاب رہتا ہے۔ عیش باغ کے میلے کے حال سے اہل لکھنو کی ذہنیت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

''ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تنزیب کے انگرکھے اور اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، چست گٹھنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اترائے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔''[4]

مناظر فطرت کو بھی رسوا نے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک فنی ذمہ داری ہوتی ہے جسے ہر کوئی نہیں نبھا سکتا۔ جیسے اس منظر میں بیان کرتے ہیں کہ :

"عجب وحشت ناک سماں دکھار ہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کوٹھی کے ایک گوشہ سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا۔"5

اس منظر سے آنے والے واقعات کی سنسنی ظاہر ہو رہی ہے۔ ڈاکوؤں کا گروہ کوٹھی میں گھس کر لوٹنے والا تھا۔ اور اس منظر سے عجب وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ اچھی منظر نگاری کے لیے اچھا طرز بیان ہونا چاہیے اور ایک دور اندیش ناول نگار ناول کو اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ قاری پر ناول کی خارجی فضا ہی نہیں بلکہ معاشرے کی تہذیب و تمدن بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نازک فنی ذمہ داری ہے جسے نبھانا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ مناظر کی یہ تصویر کشی رسوا کی باریک بین فطرت کا پتہ دیتی ہے کہ اپنے خوبصورت لفظوں سے ماحول کی نزاکت کو کم سے کم لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ناول میں کرداروں کی بھرمار ہے مگر رسوا نے نے اہم کرداروں کے علاوہ مختصر کرداروں کو بھی توجہ اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ جس سے ان کی فنی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے ناول کے ہر کردار کی تخلیق کے ایک سے زیادہ پہلو ہیں کہ یہ کردار امراؤ کے رشتے میں ایک قسم کی مناسبت رکھتے ہیں اگرچہ یہ خاص ضرورت کے تحت تخلیق کیے گئے ہیں لیکن امراؤ سے الگ ہو کر بھی ان کی انفرادیت برقرار رہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کردار اپنے مخصوص دائرے پر روشنی ڈالتا ہے اپنی زندگی کے خاص پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے یعنی ہر کردار اپنے گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اتنے زیادہ کردار شاید ہی اردو کے کسی اور ناول میں ہوں لیکن اتنے زیادہ کردار ہونے کے باوجود کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے مکمل نباہ کیا گیا ہے۔ ہر کردار ایسی تمام تر نفسیات و جذبات، عادات، واطوار خاندانی پس منظر اور موجود حیثیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ ناول کا سب سے اہم کردار امراؤ کا کردار ہے اس لیے وہ پورے قصے پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ بقول ڈاکٹر میمونہ انصاری:

"امراؤ جان ادا کا کردار اردو زبان میں اہم ترین کردار ہے یہ پہلا سنجیدہ کردار ہے جو اپنی زندگی کا ضامن ہے اب تک اس کردار کا ثانی کردار تخلیق نہیں ہوا۔"6

امراؤ جان ادا پیدائشی طوائف نہیں تھی حالات اسے طوائف بنا دیتے ہیں امراؤ کے کردار پر مرزا رسوا نے بڑی محنت کی ہے اور اس کردار میں ہونے والی تبدیلیاں دراصل ناول کو نئے نئے موڑ سے روشناس کرواتی ہیں۔ اسے اپنے ماحول سے نفرت ہے اور یہی بات اس کے کردار میں کشش پیدا کرتا ہے۔ قاری اس سے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ امراؤ جان کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو اس کا احساس ندامت ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سنانے سے پہلے کہتی ہے کہ :

"مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزہ رکھا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔۔۔۔ ننگ خاندان، عار دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں گے "7

اور رسوا کے نام اپنے خط میں اپنی زندگی کی تلخ حقیقت کو بھی اس طرح بیان کرتی ہے :

''میری خرابی کا سبب وہی دلاور خان کی شرارت تھی نہ وہ مجھے اٹھالاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی۔۔۔۔۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لیے ایک مدت ہوئی میں ان سے بے زار و تائب ہوں۔''8

یعنی امراؤ کو معاشرے نے یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا اور اس کے بعد جب اس نے توبہ تائب کی کوشش کی تو اس کے اپنوں نے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ امراؤ ایک باذوق طوائف تھی نواب سلطان اس سے تاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن قسمت کی نیرنگی کہ یہ معاشقہ بارآور ثابت نہ ہو سکا۔ گوہر مرزا، فیض علی اور اکبر علی خان سے امراؤ جان کی آشنائی تو تھی لیکن اسے عشق محبت نہیں کہا جا سکتا۔ شاہد جمیل کا خیال ہے کہ :

"امراؤ جان کے کیریکٹر کی بڑی خوبی حالات اور اشخاص کے ساتھ اس کی Adjustment ہے۔ وہ خانم جیسی سخت گیر نائیکا کی چہیتی بن سکتی ہے۔ گوہر مرزا جیسے کم ظرف اور چھچھوری طبیعت انسان کے ساتھ تادم آخر نباہ کر سکتی ہے۔ نواب سلطان جیسے تعلیق نواب کی خلوت کا موزوں ترین رفیق ثابت ہو سکتی ہے۔ راشد علی جیسے دہقانی کی طبیعت سے مل سکتی ہے اور یہاں تک کہ ایک بے درد ڈاکو کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔"
9

امراؤ جان یہ بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ طوائف چاہے تائب بھی ہو جائے، لوگ فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور اگر کسی ایک کی ہو کر رہے تو بھی یہی کہیں گے کہ ''آخر رنڈی تھی ناکفن کا چونگا لیا۔''10 اپنے مشاہدات زندگی کی روشنی میں وہ جو طرز زندگی اختیار کرتی ہے وہ اس کے لیے بہتر ہے کتب بینی، باذاق لوگوں کی محفل، صوم وصلوۃ کی پابندی اور کفایت شعاری اسے فکر و تردّد سے کسی حد تک نجات دلاتی ہے۔

نواب سلطان کا کردار ایک دور اندیش کردار ہے جو لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب میں زندگی کی رمق دکھاتا ہے۔ ان کی مصلحت اندیشی ان کے مصلحانہ جذبے کی ترجمان ہے۔

خانم کا کردار ایک کامیاب نائیکا کا کردار ہے اور ناول میں خاص مقام رکھتا ہے۔ ناول میں خانم تماش بینوں کو قدم قدم پر سامان تعیش فراہم کرتی ہے اور اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے خریدی ہوئی لڑکیوں کی پرورش کرتی ہے اور صحیح معنوں میں نواب زادوں کو ادب آداب بھی سکھاتی ہے۔ وہ مرزا صاحب سے عشق کرتی ہے اور دوسری طرف امیر صاحب کو بھی اپنی زلفوں کے دام میں اسیر کر رکھا ہے۔ خانم ایک معاملہ فہم اور دور اندیش عورت ہے۔ اس میں خوف خدا کا بھی فقدان نہیں لیکن اس کی کاروباری مجبوری کے سامنے اس کی ہمدردی دم توڑ دیتی ہے۔

بسم اللہ جان کا کردار بانکپن میں اپنی مثال آپ ہے۔ اسے ہم خاندانی طوائف کہہ سکتے ہیں یہ خانم کی بیٹی ہے اور اپنے پیشے میں کامیاب ہے۔ شوخ و شریر کسی سے دھوکہ نہیں کھاتی۔ خود غرضی بھی انتہا کی ہے۔ نواب چھبن کو صرف اپنی مادی خواہشات کا ذریعہ بنا کر رکھا۔ بسم اللہ کا کردار اپنے شوخ و شریر مکالموں کی بنا پر زندہ ہے۔ نواب حسین جو نہایت ناعاقبت اندیش انسان ہیں۔ بسم اللہ پر عاشق ہو جاتے ہیں اور ان پر لاکھوں روپے نچھاور کر دیتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ صاف گو انسان ہیں جھوٹی شیخی نہیں بگھارتے۔ وہ ذرہ بھر احسان نہیں بھولتے۔ خانم کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے بعد دریائے گھومتی میں چھلانگ لگا لیتے ہیں لیکن قسمت سے بچ جاتے ہیں اور گھر والوں سے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ یہ اپنے عہد کے نواب زادوں کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

رسوا کے ناول امراؤ جان ادا میں خورشید جان کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ من موہنی صورت کی مالک ہیں لیکن آواز اچھی نہیں۔ خورشید کے کردار کا اہم پہلو اس کا سچی محبت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیارے صاحب (جن سے وہ عشق کرتی ہے) سے ترک تعلق کے بعد وہ بھی دق کے مرض میں مبتلا ہو جاتی

ہے۔ اس کی سرشت میں ہر جائی پن نہیں۔ شریف خاندان کا خون اس کے پیشے کی مہارت میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے دل میں ایک خوبصورت گھریلو زندگی کی آس ہے۔ جیسا کہ امراؤ جان نے کہا:

"حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی کے لائق نہ تھی۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جو رو ہوتی تو خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کر پیتا بشرطیکہ قدردان ہوتا۔"[11]

ناول امراؤ جان ادا میں امراؤ کی زندگی میں چار جگہیں ایسی آتی ہیں جو اس کی زندگی کے اہم موڑ ثابت ہوتے ہیں اور ناول کو بھی پُر تجسس بنا دیتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نورالحسن:

"اس ناول میں وہ (امراؤ جان) چار جگہ مکمل طور پر زندہ ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ ایک اس وقت جب خانم صاحبہ کی حویلی سے فیضو کے ساتھ بھاگی ہے۔ دوسرے جب وہ کانپور میں پہنچ کر ایک مسجد کے ملا سے ہم کلام ہوتی ہے۔ تیسرے جب وہ اپنے موروثی مکان میں ناچنے گئی اور عزیزوں سے ملی اور چوتھے جب وہ باغ میں سیر کرتے ہوئے ایک ڈاکو کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ آخری موقع پر وہ پورے طور پر زندہ ہو گئی ہے۔"[12]

ناول میں لکھنؤ، کان پور اور فیض آباد تین ایسے مقامات ہیں جو امراؤ جان کی زندگی میں اہم تبدیلیاں لاتے ہیں۔ چونکہ امراؤ جان پیدائشی طور پر ایک طوائف نہیں معاشرہ اسے طوائف بننے پر مجبور کر دیتا ہے تو وہ امیرن سے امراؤ جان بن جاتی ہے اور لکھنؤ آکر وہ معاشرتی حقیقتوں کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی کڑواہٹ، رومان اور دردناکی سے متعارف ہوتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ اس زخم خوردہ زندگی سے تنگ آکر فرار کا فیصلہ کرتی ہے اور اس مقصد کے لیے وہ فیض علی ڈاکو کا استعمال کرتی ہے جو کوٹھے پر آکر اسے زیور اور روپے دیتا ہے اور اظہار محبت کرتا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے جانا چاہتا ہے تاکہ بقیہ زندگی دونوں ساتھ گزار سکیں۔ امراؤ بھی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس کا پورا استعمال کرتی ہے۔ اس موقع پر لگتا ہے کہ شائد امراؤ اس گناہ کی دلدل سے نجات پا جائے گی اور باقی زندگی کسی ایک کی ہو کر سکون سے گزارے گی۔ لیکن قدرت کو شاید اس کے اور امتحان مقصود تھے۔ وہ فیض علی کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے کہ راستے میں انھیں ڈاکو گھیر لیتے ہیں۔ فیض کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے اور امراؤ وہاں سے جان بچا کر کانپور پہنچ جاتی ہے اور یہاں اس کی ملاقات ایک مولوی صاحب سے ہو جاتی ہے۔ اور ان کی مدد سے وہ کانپور میں نئی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ لیکن بوا حسینی اور گوہر مرزا کی اچانک آمد اس کی دوبارہ لکھنؤ میں واپسی کا سبب بنتی ہے اور قسمت اسے ایک بار پھر وہاں لا کر کھڑا کر دیتی ہے جہاں سے وہ

چلی تھی۔ زندگی رواں دواں ہوتی ہے کہ غدر کے واقعات پیش آتے ہیں اور وہ بچتی بچاتی دوبارہ اپنے آبائی گھر فیض آباد پہنچ جاتی ہے۔ جہاں بچپن میں املی کے پیڑ کے نیچے وہ کھیلا کرتی تھی۔ وہ اپنے گھر کو بھی پہچان لیتی ہے اور والدہ کو بھی دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب روتی ہیں۔ ماں بیٹی کا درد بخوبی محسوس کر سکتی ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے چھوٹا بھائی جسے وہ بچپن میں ساتھ لیے لیے پھرتی تھی وہ بھی بال بچوں والا ہے۔ اس مقام پر آ کر قاری کے ذہن میں امراؤ کے روشن مستقبل کے بارے میں امید کا دیا روشن ہوتا ہے کہ شاید اب امراؤ کے زخموں کو مرہم مل جائے اور بھائی اسے قبول کر کے دوبارہ عزت بخش دے لیکن بھائی کا خون جوش مارتا ہے اور وہ اپنی عزت و ناموس کی خاطر امراؤ کو چاقو سے مارنے لگتا ہے۔ لیکن محبت آڑے آ جاتی ہے اور وہ چاقو پھینک کر اپنی بہن سے کہتا ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر چلی جائے۔ امراؤ فیض آباد چھوڑ کر دوبارہ لکھنو آ جاتی ہے۔ ناول کے آخر میں اس کے درد کا مداوا دلاور خان کے پکڑوانے سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے آج وہ اس حال کو پہنچی تھی۔ دلاور خان کا خاتمہ بھی اس کی نشاندہی پر ہوتا ہے اور وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ایک دن اکبر علی خان، امراؤ جان ، بسم اللہ جان، خورشید جان اور باقی کارندے بخشی کے تالاب پر سیر کے لیے آتے ہیں۔ اتفاق سے امراؤ تھوڑی دور نکل آتی ہے اور اس کی نظر دلاور خان پر پڑتی ہے۔ پولیس کی مدد سے اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور اسے پھانسی ہو جاتی ہے۔ یوں دلاور خان کیفر کردار تک پہنچتا ہے۔

امراؤ جان ادا اگر صرف طوائف کی کہانی ہوتی تو دلاور خان کی پھانسی کے بعد یہ کہانی اپنے اختتام کو پہنچ جانی چاہیے تھی۔ لیکن اگر ہم اس کہانی کے پلاٹ کی بُنت پر غور کریں تو بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ ناول مشاعرہ سے شروع ہو کر امراؤ کے خط پر ختم ہو جاتا ہے۔ ناول میں امراؤ جان کا شعری ذوق، خانم کا نگار خانہ، خانم کی تعزیہ داری ، نائیکاؤں کو مجمع عام میں اماں جان کہہ کر پکارنے والے رکھن میاں، دریائے گھومتی میں چھلانگ لگانے والے نواب چھبن، ستر سالہ درس دینے والے مولوی صاحب کا معاشقہ، نواب سلطان، بوا حسینی اور ان سے عشق کرنے والے مولوی صاحب، فیضو ڈاکو، راجہ دھیان سنگھ، اکبر علی کی جعل سازی، لڈن کی ماں کا اکبر علی خان کی بیوی کے ہاتھوں جوتیاں، کھانا، آبادی جان کی گھٹیا حرکتیں، یہ سب چھوٹے چھوٹے قصے ہیں جو ناول کی ترویج میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

مرزا محمد ہادی رسوا کا شہر آفاق ناول امراؤ جان ادا ۱۸۹۹ء میں لکھا گیا اور اب تک اردو خوان طبقے کی کئی نسلیں اسے پڑھ چکی ہیں۔ مختلف درجوں میں ادب کے نصاب کا حصہ ہونے کے سبب طالب علم اسے ضرورتاً بھی پڑھتے رہے ہیں۔ سو برس تک ناقدین ادب کی نوک قلم تلے رہنے کے سبب یہ ناول طرح طرح کی تشریحات اور

انوکھی تاویلات کا نشانہ بھی بنتا رہا ہے۔ جس میں دلچسپ ترین توضیح غالباً ترقی پسند نقاد صفدر میر کی ہے جن کے بقول امراؤ جان ادا اصل میں انگریزوں کے اس سیاسی جبر کا قصہ ہے جو انہوں نے اودھ پر اپنے حریفانہ قبضے کے لیے روا رکھا۔ لیکن حکمرانوں کے پنسر سے بچنے کے لیے مصنف نے اس غاصبانہ قصے کی کہانی پر شعر و شاعری کا گاڑھا لیپ کر کے اس پر ناچ گانے کی مرصع کاری کر دی۔ ۱۳

امراؤ جان ادا کو اردو ادب میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ بہت کم ادبی شہ پاروں کے حصے میں آئی ہے۔ ناول امراو جان ادا کا پلاٹ خوبصورت رنگوں سے تعبیر ہے اور رسوا نے یہ رنگ اتنی خوبصورتی سے کینوس پر بکھیرے ہیں کہ ایک دل کش تصویر سامنے آتی ہے اور اس تصویر کو دیکھنے والا تصویر کے نشیب و فراز میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔

حوالہ جات

1. عبدالحلیم شرر۔ گزشتہ لکھنؤ۔(لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۴۷ء)، ص۱۹
2. Picarseque کا ماخذ پسینی لفظ Picaron ہے جس کا مطلب آوارہ اور شہدا ہوتا ہے۔ معنوی لحاظ سے پکارسک کی تعریف یوں ہو گی کہ وہ قصہ جس میں پسینی آوارہ گرد کی داستانِ حیات بیان کی گئی ہو اور اصطلاحاً وہ ناول مراد لیا جاتا ہے جس میں تمام واقعات ایک مرکزی کردار کے گرد گھومتے ہوں۔
3. میمونہ بیگم مارھروی۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۲۳ء)، ص۲۲۳۔۲۲۴
4. مرزا محمد ہادی رسوا۔امراؤ جان ادا۔ ص۱۳۸
5. ایضاً، ص۱۸۹، ۱۸۸
6. میمونہ بیگم مارھروی۔ مرزا محمد ہادی رسوا۔ ص۲۴۴
7. مرزا محمد ہادی رسوا۔امراؤ جان ادا۔ ص۳۸
8. ایضاً، ص۲۵۳
9. شاہد جمیل۔امراؤ جان ادا ایک خصوصی مطالعہ۔(الٰہ آباد: اسرار کریمی پریس، ۱۹۹۱ء)، ص۱۰۸
10. مرزا محمد ہادی رسوا۔امراؤ جان ادا۔ ص۲۵۶
11. ایضاً، ص۱۳۴
12. محمد احسن فاروقی۔ سید نورالحسن۔ ناول کیا ہے؟(لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۴ء)، ص۱۴۸
13. محمد صفدر میر، تصورات، مرتبہ شیما مجید (لاہور: کلاسیک، 1997ء)، ص ۷۱